روشنی اے روشنی

کلیاتِ شکیبؔ جلالیؒ

شکیبؔ جلالی

عرض ناشر

اس مجموعے کا نام ''روشنی اے روشنی'' خود شکیبؔ مرحوم کا تجویز کردہ ہے۔

شکیبؔ کے انتقال کے چند روز بعد ان کی بیوہ کی طرف سے مجھے کاغذات کا ایک انبار موصول ہوا جو شکیبؔ کے کلام کے تراشوں اور ان کی چند نامکمل بیاضوں پر مشتمل تھا۔ ان کے مطالعے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ شکیبؔ کے ابتدائی کلام کا انتخاب نہایت ضروری ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ شکیب کے آخری پانچ چھ برس کے کلام میں سے کوئی غزل یا نظم رہ نہ جائے۔ کیونکہ یہی وہ دور ہے جب شکیبؔ کی شاعرانہ عظمت صورت پذیر ہونے لگی تھی۔ اس کام میں بہت دن صرف ہو گئے اس کے بعد ملکی حالات نے ایسا رخ اختیار کر لیا کہ ماحول تخلیقی ادب کے کسی بھی مجموعے کی اشاعت کے لیے سازگار نہ رہا' چنانچہ ''روشنی اے روشنی'' کی اشاعت ملتوی ہوتی رہی۔ اب بھی اشاعتی اور طباتی صورتِ حال کچھ ایسی ہمت افزا نہیں ہے۔ مگر شکیبؔ کے مجموعہ کلام کی اشاعت میں مزید تاخیر ناقابلِ برداشت تھی اس لیے یہ مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے جملہ حقوقِ اشاعت و اخذ و ترجمہ شکیبؔ کی بیوہ محترمہ محدّثہ خاتون کے حق میں

محفوظ ہیں۔

قارئین سے استدعا ہے کہ اگر اس کے مطالعے کے بعد انہیں محسوس ہو کہ شکیبؔ کی کوئی اہم غزل یا نظم مجموعے میں شامل نہیں ہو سکی، تو اس کی نقل بھجوا کر ممنون کریں تا کہ آئندہ اشاعت میں یہ کمی پوری کر دی جائے۔

احمد ندیم قاسمی

یکم جولائی ۱۹۷۲ء

فصیلِ جسم پہ تازہ لہُو کے چھینٹے ہیں
حُدودِ وقت سے آ گے گیا ہے کوئی

غزلیات

نظمیں

۱۔ پاداش
۲۔ اِندمال
۳۔ جہت کی تلاش
۴۔ دلاسا
۵۔ یاد
۶۔ جاگتی آنکھیں
۷۔ گریز پا
۸۔ لرزتا دیپ
۹۔ سفیر
۱۰۔ انفرادیت پرست
۱۱۔ عکس اور میں
۱۲۔ دعوتِ فکر
۱۳۔ زاویے
۱۴۔ ہمارا دَور
۱۵۔ شہرِ گُل
۱۶۔ خداوندانِ جمہور سے
۱۷۔ نئی کرن
۱۸۔ جشنِ عید

۱۹۔ لَہُو ترنگ
۲۰۔ عید کی بھیک
۲۱۔ بنامِ اہلِ چمن

☆

گلے ملا نہ کبھی چاند، بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا

ستارے سِسکیاں بھرتے تھے، اوس روتی تھی
فسانۂ جگرِ لخت لخت ایسا تھا

ذرا نہ موم ہُوا پیار کی حرارت سے
چٹخ کے ٹوٹ گیا، دل کا سخت ایسا تھا

یہ اور بات کہ وہ لَب تھے پھول سے نازک
کوئی نہ سہہ سکے، لہجہ کرخت ایسا تھا

کہاں کی سَیر نہ کی تَوسنِ تخیّل پر
ہمیں تو یہ بھی سلیماں کے تخت ایسا تھا

اِدھر سے گزرا تھا مُلکِ سُخن کا شہزادہ
کوئی نہ جان سکا، سازو رخت ایسا تھا

☆

آ کے پتّھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے، پسِ دیوار گرے

ایسی دہشت تھی فضاؤں میں کُھلے پانی کی
آنکھ جھپکی بھی نہیں، ہاتھ سے پتوار گرے

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

تیرگی چھوڑ گئے دل میں اُجالے کے خطوط
یہ ستارے مرے گھر ٹوٹ کے بے کار گرے

کیا ہَوا ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی تھی
کیوں مجھے ڈھال بنانے کو یہ چھتنار گرے

دیکھ کر اپنے دروبام، لرز جاتا ہوں
میرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہُوئی تلوار گرے

ہم سے ٹکرا گئی خود بڑھ کے اندھیرے کی چٹان
ہم سنبھل کر جو بہت چلتے تھے، ناچار گرے

کیا کہوں دیدۂ تر، یہ تو مرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں، بارش کی جہاں دھار گرے

ہاتھ آیا نہیں کچھ رات کی دلدل کے سوا
ہائے کس موڑ پہ خوابوں کے پرستار گرے

وہ تجلّی کی شعاعیں تھیں کہ جلتے ہُوئے تیر
آئنے ٹوٹ گئے، آئنہ بردار گرے

دیکھتے کیوں ہو شکیبؔ اتنی بلندی کی طرف
نہ اٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے

☆

شفق جو رُوئے سحَر پر گُلال ملنے لگی
یہ بستیوں کی فضا کیوں دُھواں اُگلنے لگی

اسی لیے تو ہوا رو پڑی درختوں میں
ابھی میں کِھل نہ سکا تھا کہ رُت بدلنے لگی

اُتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہُوا
زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

کسی کا جسم اگر چُھو لیا خیال میں بھی
تو پور پور مری، مثلِ شمع جلنے لگی

میں ناپتا چلا قدموں سے اپنے سائے کو
کبھی جو دشتِ مسافت میں دھوپ ڈھلنے لگی

مری نگاہ میں خواہش کا شائبہ بھی نہ تھا
یہ برف سی ترے چہرے پہ کیوں پگھلنے لگی

ہَوا چلی سرِ صحرا ' تو یوں لگا ' جیسے
ردائے شام مرے دوش سے پھسلنے لگی

کہیں پڑا نہ ہو پَرتَو بہارِ رفتہ کا
یہ سبز بُوند سی پلکوں پہ کیا مچلنے لگی

نہ جانے کیا کہا اس نے بہت ہی آہستہ
فضا کی ٹھہری ہُوئی سانس پھر سے چلنے لگی

جو دل کا زہر تھا کاغذ پہ سب بکھیر دیا
پھر اپنے آپ طبیعت مری سنبھلنے لگی

جہاں شجر پہ لگا تھا تبر کا زخم شکیبؔ
وہیں پہ دیکھ لے ' کونپل نئی نکلنے لگی

☆

وہی جُھکی ہوئی بیلیں، وہی دریچہ تھا
مگر وہ پھول سا چہرہ نظر نہ آتا تھا

میں لوٹ آیا ہوں خاموشیوں کے صحرا سے
وہاں بھی تیری صدا کا غُبار پھیلا تھا

قریب تیر رہا تھا بطوں کا اک جوڑا
میں آب جُو کے کنارے اُداس بیٹھا تھا

شبِ سفر تھی، قبا تیرگی کی پہنے ہُوئے
کہیں کہیں پہ کوئی روشنی کا دھبّا تھا

بنی نہیں جو کہیں پر، کلی کی تُربت تھی
سُنا نہیں جو کسی نے، ہوا کا نوحہ تھا

یہ آڑھی ترچھی لکیریں بنا گیا ہے کون
میں کیا کہوں، مرے دل کا وَرق تو سادا تھا

میں خاکداں سے نکل کر بھی کیا ہُوا آزاد
ہر اک طرف سے مجھے آسماں نے گھیرا تھا

اُتر گیا ترے دل میں تو شعر کہلایا
میں اپنی گونج تھا اور گنبدوں میں رہتا تھا

اُدھر سے بارہا گزرا مگر خبر نہ ہوئی
کہ زیرِ سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا

وہ اس کا عکسِ بدن تھا کہ چاندنی کا کنول
وہ نیلی جھیل تھی یا آسماں کا ٹکڑا تھا

میں ساحلوں میں اُتر کر شکیبؔ کیا لیتا
ازل سے نام مرا پانیوں پہ لکھا تھا

☆

خزاں کے چاند نے پوچھا یہ جُھک کے کھڑکی میں
کبھی چراغ بھی جلتا ہے اس حویلی میں؟

یہ آدمی ہیں کہ سائے ہیں آدمیّت کے
گزر ہُوا ہے مرا کس اُجاڑ بستی میں!

جُھکی چٹان، پھسلتی گرفت، جُھولتا جسم
میں اب گِرا ہی گِرا تنگ و تار گھاٹی میں

زمانے بھر سے نرالی ہے آپ کی منطِق
ندی کو پار کیا کس نے اُلٹی کشتی میں

جلائے کیوں، اگر اتنے ہی قیمتی تھے خطوط
کُریدتے ہو عبث راکھ اب انگیٹھی میں

عجب نہیں جو اُگیں یاں درخت پانی کے
کہ اشک بوئے ہیں شب بھر کسی نے دھرتی میں

مری گرفت میں آ کر نِکل گئی تِتلی
پروں کے رنگ مگر رہ گئے ہیں مُٹھّی میں

چلو گے ساتھ مرے، آ گہی کی سرحد تک؟
یہ رہ گزار اُترتی ہے گہرے پانی میں

میں اپنی بے خبری سے شکیبؔ واقف ہوں
بتاؤ پیچ ہیں کتنے تمہاری پگڑی میں

☆

وہ دُوریوں کا رہِ آب پر نشان کھلا
وہ رینگنے لگی کشتی، وہ بادبان کُھلا

مرے ہی کان میں سرگوشیاں سُکوت نے کیں
مرے سوا بھی کسی سے یہ بے زبان کُھلا

سمجھ رہا تھا ستارے جنھیں، وہ آنکھیں ہیں
مری طرف نگراں ہیں کئی جہان، کُھلا

مرا خزانہ ہے محفوظ میرے سینے میں
میں سو رہوں گا یونہی چھوڑ کر مکان کُھلا

ہر آن میرا نیا رنگ ہے نیا چہرہ
وہ بھید ہوں جو کسی سے نہ میری جان، کُھلا

جزا کہیں کہ سزا اس کو بال و پر والے
زمیں سکڑتی گئی، جتنا آسمان کُھلا

لہُو لہُو ہوں سلاخوں سے سر کو ٹکرا کر
شکیبؔ، بابِ قفس، کیا کہوں، کس آن کُھلا

☆

آیا ہے ہر چڑھائی کے بعد اک اُتار بھی
پستی سے ہمکنار ملے کوہسار بھی

آخر کو تھک کے بیٹھ گئی اک مقام پر
کچھ دور میرے ساتھ چلی رہ گزار بھی

دل کیوں دھڑکنے لگتا ہے اُبھرے جو کوئی چاپ
اب تو نہیں کسی کا مجھے انتظار بھی

جب بھی سکوتِ شام میں آیا ترا خیال
کچھ دیر کو ٹھہر سا گیا آبشار بھی

کچھ ہو گیا ہے دُھوپ سے خاکستری بدن
کچھ جم گیا ہے راہ کا مجھ پر غُبار بھی

اس فاصلوں کے دشت میں رہبر وہی بنے
جس کی نگاہ دیکھ لے صدیوں کے پار بھی

اے دوست، پہلے قُرب کا نشّہ عجیب تھا
میں سُن سکا نہ اپنے بدن کی پُکار بھی

رستہ بھی واپسی کا کہیں بن میں کھو گیا
اوجھل ہُوئی نگاہ سے ہرنوں کی ڈار بھی

کیوں رو رہے ہو راہ کے اندھے چراغ کو!
کیا بُجھ گیا ہوا سے لہُو کا شرار بھی؟

کچھ عقل بھی ہے باعثِ توقیر اے شکیبؔ
کچھ آ گئے ہیں بالوں میں چاندی کے تار بھی

☆

کنارِ آب کھڑا خود سے کہہ رہا ہے کوئی
گُماں گزرتا ہے، یہ شخص دوسرا ہے کوئی

ہوا نے توڑ کے پتّہ زمیں پہ پھینکا ہے
کہ شب کی جھیل میں پتّھر گرا دیا ہے کوئی

بٹا سکے ہیں پڑوسی کِسی کا درد کبھی!
یہی بہت ہے کہ چہرے سے آشنا ہے کوئی

درخت راہ بتائیں ہلا ہلا کر ہاتھ
کہ قافلے سے مُسافر بچھڑ گیا ہے کوئی

چُھڑا کے ہاتھ بہت دور بہہ گیا ہے چاند
کسی کے ساتھ سمندر میں ڈُوبتا ہے کوئی

یہ آسمان سے ٹوٹا ہُوا ستارہ ہے
کہ دشتِ شب میں بھٹکتی ہوئی صدا ہے کوئی

مکان اور نہیں ہے، بدل گیا ہے مکیں
اُفق وہی ہے مگر چاند دوسرا ہے کوئی

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حُدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

شکیبؔ دیپ سے لہرا رہے ہیں پلکوں پر
دیارِ چشم میں کیا آج رَت جَگا ہے کوئی!

☆

درد کے موسم کا کیا ہو گا اثر انجان پر
دوستو! پانی کبھی رکتا نہیں ڈھلوان پر

آج تک اس کے تعاقب میں بگولے ہیں رَواں
ابر کا ٹکڑا کبھی برسا تھا ریگستان پر

میں جو پربت پر چڑھا' وہ اور اُونچا ہوگیا
آسماں جُھکتا نظر آیا مجھے میدان پر

کمرے خالی ہوگئے' سایوں سے آنگن بھر گیا
ڈُوبتے سورج کی کرنیں جب پڑیں دالان پر

اب یہاں کوئی نہیں ہے' کس سے باتیں کیجیے
یہ مگر چُپ چاپ سی تصویر آتشدان پر

آج بھی شاید کوئی پھولوں کا تحفہ بھیج دے
تتلیاں منڈلا رہی ہیں کانچ کے گُلدان پر

بس چلے تو اپنی عُریانی کو اس سے ڈھانپ لوں
نیلی چادر سی تنی ہے جو کُھلے میدان پر

وہ خموشی انگلیاں چٹخا رہی تھی اے شکیبؔ
یا کہ بوندیں بج رہی تھیں رات روشندان پر

☆

میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں
مُرجھا کے آ گرا ہوں مگر سرد گھاس میں

سوچو تو سِلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لَباس میں

صحرا کی بُودوباش ہے، اچھّی نہ کیوں لگے
سُوکھی ہُوئی گلاب کی ٹہنی گلاس میں

چمکے نہیں نظر میں ابھی نقش دُور کے
مصروف ہوں ابھی عملِ اِنعکاس میں

دھوکے سے اس حسیں کو اگر چُوم بھی لیا
پاؤ گے دل کا زہر لَبوں کی مٹھاس میں

تارہ کوئی رِدائے شبِ ابر میں نہ تھا
بیٹھا تھا میں اداس بیابانِ یاس میں

جُوئے روانِ دشت! ابھی سُوکھنا نہیں
ساون ہے دُور اور وہی شدّت ہے پیاس میں

رہتا تھا سامنے ترا چہرہ کُھلا ہُوا
پڑھتا تھا میں کتاب یہی ہر کلاس میں

کانٹوں کی باڑ پھاند گیا تھا مگر شکیبؔ
رستہ نہ مل سکا مجھے پُھولوں کی باس میں

☆

ہم جنس اگر ملے نہ کوئی آسمان پر
بہتر ہے خاک ڈالیے ایسی اُڑان پر

آکر گرا تھا کوئی پرندہ لہُو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

پوچھو سمندروں سے کبھی خاک کا پتہ
دیکھو ہوا کا نقش کبھی بادبان پر

یارو، میں اس نظر کی بلندی کو کیا کروں
سایہ بھی اپنا دیکھتا ہوں آسمان پر

کتنے ہی زخم ہیں مرے اک زخم میں چھُپے
کتنے ہی تیر آنے لگے اک نشان پر

جل تھل ہُوئی تمام زمیں آس پاس کی
پانی کی بوند بھی نہ گری سائبان پر

ملبُوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے
چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

سایہ نہیں تھا نیند کا آنکھوں میں دُور تک
بکھرے تھے روشنی کے نگیں آسمان پر

حق بات آکے رُک سی گئی تھی کبھی شکیبؔ
چھالے پڑے ہُوئے ہیں ابھی تک زبان پر

☆

غمِ دل حیطۂ تحریر میں آتا ہی نہیں
جو کناروں میں سمٹ جائے وہ دریا ہی نہیں

اوس کی بوندوں میں بکھرا ہُوا منظر جیسے
سب کا اِس دَور میں یہ حال ہے، میرا ہی نہیں

برق کیوں ان کو جلانے پہ کمربستہ ہے
میں تو چھاؤں میں کسی پیڑ کی، بیٹھا ہی نہیں

اک کرن تھام کے میں دُھوپ نگر تک پہنچا
کون سا عرش ہے جس کا کوئی زینہ ہی نہیں

کوئی بُھولا ہُوا چہرہ نظر آئے شاید
آئنہ غور سے تونے کبھی دیکھا ہی نہیں

بوجھ لمحوں کا، ہر اک سر پہ اُٹھائے گزرا
کوئی اس شہر میں سُستانے کو ٹھہرا ہی نہیں

سایہ کیوں جل کے ہُوا خاک، تجھے کیا معلوم
تو کبھی آگ کے دریاؤں میں اُترا ہی نہیں

موتی کیا کیا نہ پڑے ہیں تہِ دریا لیکن
برف لہروں کی، کوئی توڑنے والا ہی نہیں

اس کے پردوں پہ منقّش تری آواز بھی ہے
خانۂ دل میں فقط تیرا سراپا ہی نہیں

حائلِ راہ تھے کتنے ہی ہوا کے پربت
تو وہ بادل کہ مرے شہر سے گزرا ہی نہیں

یاد کے دائرے کیوں پھیلتے جاتے ہیں شکیبؔ
اس نے تالاب میں کنکر ابھی پھینکا ہی نہیں

☆

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت

کسی کے سر پہ کبھی ٹوٹ کر گرا ہی نہیں
اس آسماں نے ہوا میں قدم جمائے بہت

نہ جانے رُت کا تصرّف تھا یا نظر کا فریب
کلی وہی تھی مگر رنگ جھلملائے بہت

ہوا کا رُخ ہی اچانک بدل گیا ورنہ
مہک کے قافلے صحرا کی سمت آئے بہت

یہ کائنات ہے میری ہی خاک کا ذرّہ
میں اپنے دشت سے گزرا تو بھید پائے بہت

جو موتیوں کی طلَب نے کبھی اُداس کیا
تو ہم بھی راہ سے کنکر سمیٹ لائے بہت

بس ایک رات ٹھہرنا ہے، کیا گلہ کیجئے
مسافروں کو غنیمت ہے یہ سرائے بہت

جمی رہے گی نگاہوں پہ تیرگی دن بھر
کہ رات خواب میں تارے اُتر کے آئے بہت

شکیبؔ کیسی اُڑان، اب وہ پر ہی ٹوٹ گئے
کہ زیرِ دام جب آئے تھے، پھڑ پھڑائے بہت

☆

تیز آندھیوں میں اُڑتے پر و بال کی طرح
ہر شے گزشتنی ہے مہ و سال کی طرح

کیوں کر کہوں کہ درپئے آزار ہے وہی
جو آسماں ہے سر پہ مرے ڈھال کی طرح

یوں بے سبب تو کوئی انہیں پُوجتا نہیں
کچھ تو ہے پتھروں میں خدوخال کی طرح

کیا کچھ کیا نہ خود کو چُھپانے کے واسطے
عُریانیوں کو اوڑھ لیا شال کی طرح

اب تک مرا زمین سے رشتہ ہے اُستوار
رہنِ ستم ہوں سبزۂ پامال کی طرح

میں خود ہی جلوہ ریز ہوں، خود ہی نگاہِ شوق
شفّاف پانیوں پہ جھکی ڈال کی طرح

ہر موڑ پر ملیں گے کئی راہ زن شکیبؔ
چلیے چھپا کے غم بھی زر و مال کی طرح

☆

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

نہ اتنی تیز چلے، سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتّا دکھائی دیتا ہے

بُرا نہ مانیے لوگوں کی عیب جوئی کا
انہیں تو دن کا بھی سایا دکھائی دیتا ہے

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

وہیں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اب تو
وہ دُور کوئی جزیرا دکھائی دیتا ہے

وہ الوداع کا منظر، وہ بھیگتی پلکیں
پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے

مری نگاہ سے چھپ کر کہاں رہے گا کوئی
کہ اب تو سنگ بھی شیشہ دکھائی دیتا ہے

سمٹ کے رہ گئے آخر پہاڑ سے قد بھی
زمیں سے ہر کوئی اُونچا دکھائی دیتا ہے

کِھلی ہے دل میں کسی کے بدن کی دُھوپ شکیبؔ
ہر ایک پُھول سنہرا دکھائی دیتا ہے

☆

پھر سن رہا ہوں گزرے زمانے کی چاپ کو
بھولا ہُوا تھا دیر سے میں اپنے آپ کو

رہتے ہیں کچھ ملُول سے چہرے پڑوس میں
اتنا نہ تیز کیجیے ڈھولک کی تھاپ کو

اشکوں کی ایک نہر تھی جو خشک ہوگئی
کیوں کر مٹاؤں دل سے ترے غم کی چھاپ کو

کتنا ہی بے کنار سمندر ہو، پھر بھی دوست
رہتا ہے بے قرار ندی کے ملاپ کو

پہلے تو میری یاد سے آئی حیا انہیں
پھر آئنے میں چوم لیا اپنے آپ کو

تعریف کیا ہو قامتِ دلدار کی شکیبؔ
تجسیم کر دیا ہے کسی نے الاپ کو

☆

خموشی بول اُٹھے، ہر نظر پیغام ہوجائے
یہ سنّاٹا اگر حد سے بڑھے کہرام ہوجائے

ستارے مشعلیں لے کر مجھے بھی ڈھونڈنے نکلیں
میں رستہ بھول جاؤں، جنگلوں میں شام ہوجائے

میں وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنہائی کے صحرا میں
خود اپنی چاپ سُن کر لرزہ براندام ہوجائے

مثال ایسی ہے اس دورِ خرد کے ہوش مندوں کی
نہ ہو دامن میں ذرّہ اور صحرا نام ہوجائے

شکیبؔ اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہوجائے

☆

یادیں ہیں اپنے شہر کی، اہلِ سفر کے ساتھ
صحرا میں لوگ آئے ہیں دیوار و در کے ساتھ

منظر کو دیکھ کر پسِ منظر بھی دیکھیے
بستی نئی بسی ہے پُرانے کھنڈر کے ساتھ

سائے میں جان پڑگئی دیکھا جو غور سے
مخصوص یہ کمال ہے اہلِ نظر کے ساتھ

اک دن ملا تھا بام پہ، سورج کہیں جسے
اُلجھے ہیں اب بھی دھوپ کے ڈورے نگر کے ساتھ

اک یاد ہے کہ دامنِ دل چھوڑتی نہیں
اک بیل ہے کہ لپٹی ہُوئی ہے شجر کے ساتھ

اس مرحلے کو موت بھی کہتے ہیں دوستو
اک پل میں ٹوٹ جائیں جہاں عمر بھر کے ساتھ

میری طرح یہ صبح بھی فنکار ہے شکیبؔ
لکھتی ہے آسماں پہ غزل، آبِ زر کے ساتھ

☆

اس بُت کدے میں تُو جو حسیں تر لگا مجھے
اپنے ہی اک خیال کا پیکر لگا مجھے

جب تک رہی جگر میں لہو کی ذرا سی بوند
مُٹّھی میں اپنی بند سمندر لگا مجھے

مُرجھا گیا جو دل میں اُجالے کا سُرخ پھول
تاروں بھرا یہ کھیت بھی بنجر لگا مجھے

اب یہ بتا کہ روح کے شُعلے کا کیا ہے رنگ
مرمر کا یہ لَباس تو سُندر لگا مجھے

کیا جانیے کہ اتنی اُداسی تھی رات کیوں
مہتاب اپنی قبر کا پتّھر لگا مجھے

آنکھوں کو بند کر کے بڑی روشنی ملی
مدّھم تھا جو بھی نقش، اُجاگر لگا مجھے

یہ کیا کہ دل کے دیپ کی لَو ہی تراش لی
سورج اگر ہے، کرنوں کی جھالر لگا مجھے

صدیوں میں طے ہُوا تھا بیاباں کا راستہ
گلشن کو لَوٹتے ہُوئے پل بھر لگا مجھے

میں نے اسے شریکِ سفر کر لیا شکیبؔ
اپنی طرح سے چاند جو بے گھر لگا مجھے

☆

مُرجھا کے کالی جھیل میں گرتے ہُوئے بھی دیکھ
سُورج ہوں، میرا رنگ مگر دن ڈھلے بھی دیکھ

ہر چند راکھ ہو کے بکھرنا ہے راہ میں
جلتے ہُوئے پروں سے اُڑا ہوں، مجھے بھی دیکھ

عالم میں جس کی دُھوم تھی، اس شاہکار پر
دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ، مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

بچھتی تھیں جس کی راہ میں پھولوں کی چادریں
اب اس کی خاک گھاس کے پیروں تلے بھی دیکھ

کیا شاخِ باثمر ہے جو تکتا ہے فرش کو
نظریں اُٹھا شکیبؔ، کبھی سامنے بھی دیکھ

☆

ساحل تمام اشکِ ندامت سے اَٹ گیا
دریا سے کوئی شخص تو پیاسا پلٹ گیا

لگتا تھا بے کراں مجھے صحرا میں آسماں
پہنچا جو بستیوں میں تو خانوں میں بٹ گیا

یا اتنا سخت جان کہ تلوار بے اثر
یا اتنا نرم دل کہ رگِ گُل سے کٹ گیا

بانہوں میں آسکا نہ حویلی کا اِک ستُون
پُتلی میں میری آنکھ کی، صحرا سمٹ گیا

اب کون جائے کوئے ملامت کو چھوڑ کر
قدموں سے آکے اپنا ہی سایہ لپٹ گیا

گنبد کا کیا قصور، اُسے کیوں کہو بُرا
آیا جدھر سے تیر، اُدھر ہی پلٹ گیا

رکھتا ہے خود سے کون حریفانہ کشمکش
میں تھا کہ رات اپنے مقابل ہی ڈٹ گیا

جس کی اَماں میں ہوں، وہی اکتا گیا نہ ہو
بوندیں یہ کیوں برستی ہیں، بادل تو چَھٹ گیا

وہ لمحۂ شعور جسے جانکنی کہیں
چہرے سے زندگی کے، نقابیں اُلٹ گیا

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہُوا ضرور
رستے میں جو کھڑا تھا وہ کہسار ہٹ گیا

اک حشر سا بپا تھا مرے دل میں اے شکیبؔ
کھولیں جو کھڑکیاں تو ذرا شور گھٹ گیا

☆

عشق پیشہ نہ رہے داد کے حقدار یہاں
پیش آتے ہیں رُعونت سے جفا کار یہاں

سر پٹک کر درِ زنداں پہ صبا نے یہ کہا
ہے دریچہ، نہ کوئی روزنِ دیوار یہاں

عہد و پیمانِ وفا، پیار کے نازک بندھن
توڑ دیتی ہے زروسیم کی جھنکار یہاں

ننگ و ناموس کے بکتے ہُوئے انمول رتن
لَب و رخسار کے سجتے ہُوئے بازار یہاں

سرخیٔ دامنِ گُل کس کو میسّر آئی؟
اپنے ہی خوں میں نہائے لَب و رُخسار یہاں

کشتیٔ زیست سلامت ہے نہ پتوار یہاں
موج درموج ہیں سو رنگ کے منجدھار یہاں

ہمسفر چُھوٹ گئے، راہنما رُوٹھ گئے
یوں بھی آسان ہُوئی منزلِ دشوار یہاں

تیرگی ٹوٹ پڑی، زور سے بادل گرجا
بجھ گئی سہم کے قندیلِ رُخِ یار یہاں

کتنے طوفان اُٹھے، کتنے ستارے ٹوٹے
پھر بھی ڈُوبا نہیں اب تک دلِ بیدار یہاں

میرے زخمِ کفِ پا چومنے آئے گی بہار
میں اگر مر بھی گیا ، وادیٔ پُرخار یہاں

☆

اتریں عجیب روشنیاں، رات خواب میں
کیا کیا نہ عکس تیر رہے تھے سراب میں

کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہُوئی
وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں

پانی نہیں کہ اپنے ہی چہرے کو دیکھ لوں
منظر زمیں کے ڈھونڈتا ہوں ماہتاب میں

پھر تیرگی کے خواب سے چونکا ہے راستہ
پھر روشنی سی دوڑ گئی ہے سحاب میں

کب تک رہے گا رُوح پہ پیراہنِ بدن
کب تک ہَوا اسیر رہے گی حَباب میں

یوں آئنہ بدست ملی پربتوں کی برف
شرما کے دھوپ لَوٹ گئی آفتاب میں

جینے کے ساتھ موت کا ڈر ہے لگا ہُوا
خشکی دکھائی دی ہے سمندر کو خواب میں

گزری ہے بار بار مرے سر سے موجِ خشک
اُبھرا ہوں ڈوب ڈوب کے تصویرِ آب میں

اک یاد ہے کہ چھین رہی ہے لبوں سے جام
اک عکس ہے کہ کانپ رہا ہے شراب میں

چوما ہے میرا نام لبِ سُرخ نے شکیبؔ
یا پھول رکھ دیا ہے کسی نے کتاب میں

☆

کیا کہیے کہ اب اس کی صدا تک نہیں آتی
اُونچی ہوں فصیلیں تو ہَوا تک نہیں آتی

شاید ہی کوئی آ سکے اس موڑ سے آگے
اس موڑ سے آگے تو قضا تک نہیں آتی

وہ گُل نہ رہے، نکہتِ گُل خاک ملے گی
یہ سوچ کے گلشن میں صبا تک نہیں آتی

اس شورِ تلاطم میں کوئی کس کو پکارے
کانوں میں یہاں اپنی صدا تک نہیں آتی

خوددار ہوں، کیوں آؤں درِ اہلِ کرم پر
کھیتی کبھی خود چل کے گھٹا تک نہیں آتی

اس دشت میں قدموں کے نشاں ڈھونڈ رہے ہو
پیڑوں سے جہاں چھَن کے ضیاء تک نہیں آتی

یا جاتے ہُوئے مجھ سے لپٹ جاتی تھیں شاخیں
یا میرے بلانے سے صبا تک نہیں آتی

کیا خشک ہُوا روشنیوں کا وہ سمندر
اب کوئی کرن، آبلہ پا تک نہیں آتی

چُھپ چُھپ کے سدا جھانکتی ہیں خلوتِ گُل میں
مہتاب کی کرنوں کو حیا تک نہیں آتی

یہ کون بتائے عدم آباد ہے کیسا!
ٹوٹی ہُوئی قبروں سے صدا تک نہیں آتی

بہتر ہے، پلٹ جاؤ سیہ خانۂ غم سے
اس سرد گپھا میں تو ہوا تک نہیں آتی

☆

جب تک غمِ جہاں کے حوالے ہُوئے نہیں
ہم زندگی کے جاننے والے ہُوئے نہیں

کہتا ہے آفتاب، ذرا دیکھنا کہ ہم
ڈُوبے تھے گہری رات میں، کالے ہُوئے نہیں

چلتے ہو سینہ تان کے دھرتی پہ کس لیے
تم آسماں تو سر پہ سنبھالے ہُوئے نہیں

انمول وہ گُہر ہیں جہاں کی نگاہ میں
دریا کی جو تہوں سے نکالے ہُوئے نہیں

طے کی ہے ہم نے صورتِ مہتاب راہِ شب
طولِ سفر سے پاؤں میں چھالے ہُوئے نہیں

ڈس لیں تو ان کے زہر کا آسان ہے اُتار
یہ سانپ آستین کے پالے ہُوئے نہیں

تیشے کا کام ریشۂ گُل سے لیا شکیبؔ
ہم سے پہاڑ کاٹنے والے ہُوئے نہیں

☆

جلتے صحراؤں میں پھیلا ہوتا
کاش میں پیڑوں کا سایا ہوتا

تو جو اس راہ سے گزرا ہوتا
تیرا ملبوس بھی کالا ہوتا

میں گھٹا ہوں، نہ پوَن ہوں، نہ چراغ
ہمنشیں میرا کوئی کیا ہوتا

زخمِ عُریاں تو نہ دیکھے گا کوئی
میں نے کچھ بھیس ہی بدلا ہوتا

کیوں سفینے میں چھپاتا دریا
گر تجھے پار اُترنا ہوتا

بَن میں بھی ساتھ گئے ہیں سائے
میں کسی جا تو اکیلا ہوتا

مجھ سے شفّاف ہے سینہ کس کا
چاند اس جھیل میں اُترا ہوتا

اور بھی ٹوٹ کے آتی تری یاد
میں جو کچھ دن تجھے بُھولا ہوتا

راکھ کر دیتے جلا کر شعلے
یہ دھواں دل میں نہ پھیلا ہوتا

کچھ تو آتا مری باتوں کا جواب
یہ کنواں اور جو گہرا ہوتا

نہ بکھرتا جو فضا میں نغمہ
سینۂ نَے میں تڑپتا ہوتا

اور کچھ دُور تو چلتے مرے ساتھ
اور اک موڑ تو کاٹا ہوتا

تھی مقدّر میں خزاں ہی تو شکیبؔ
میں کسی دشت میں مہکا ہوتا

☆

ملا نہیں اِذنِ رقص جن کو کبھی تو وہ بھی شرار دیکھو
اگر ہو اہلِ نگاہ یارو چٹان کے آر پار دیکھو

یہ جان لینا، وہاں بھی کوئی کسی کی آمد کا منتظر تھا
کسی مکاں کے جو بام و در پر بجھے دِیوں کی قطار دیکھو

اگرچہ بے خانماں ہیں، لیکن ہمارا ملنا نہیں ہے مشکل
ادھر ہی صحرا میں دوڑ پڑنا، جدھر سے اٹھتا غبار دیکھو

عجب نہیں ہے، پہاڑیوں پر شَفَق کا سونا پگھل رہا ہو
مکانِ تیرہ کے رَوزنوں میں یہ نور کے آبشار دیکھو

جو ابرِ رحمت سے ہو نہ پایا، کیا ہے وہ کام آندھیوں نے
نہیں ہے خار و گیاہ باقی، چمک اُٹھا رہگزار، دیکھو

وہ راگ خاموش ہو چکا ہے، سنانے والا بھی سو چکا ہے
لرز رہے ہیں مگر ابھی تک شکستہ بربط کے تار، دیکھو

اک آہ بھرنا شکیبؔ ہم سے خزاں نصیبوں کو یاد کر کے
کلائیوں میں جو ٹہنیوں کی، مہکتی کلیوں کے ہار دیکھو

☆

غمِ اُلفت مرے چہرے سے عیاں کیوں نہ ہُوا
آگ جب دل میں سلگتی تھی، دُھواں کیوں نہ ہوا

سیلِ غم رُکتا نہیں ضبط کی دیواروں سے
جوشِ گریہ تھا تو میں گریہ کُناں کیوں نہ ہُوا

کہتے ہیں، حُسن خدوخال کا پابند نہیں
ہر حَسیں شے پہ مجھے تیرا گماں کیوں نہ ہُوا

دشت بھی اس کے مکیں، شہر بھی اس میں آباد
تو جہاں آن بسے دل وہ مکاں کیوں نہ ہوا

ق

تو وہی ہے جو مرے دل میں چُھپا بیٹھا ہے
اک یہی راز کبھی مجھ پہ عیاں کیوں نہ ہُوا

یہ سمجھتے ہُوئے مقصودِ نظر ہے تُو ہی
میں ترے حُسن کی جانب نگراں کیوں نہ ہُوا

اس سے پہلے کہ ترے لمس کی خوشبو کھو جائے
تجھ کو پا لینے کا ارمان جواں کیوں نہ ہُوا

ق

تپتے صحرا تو مری منزلِ مقصود نہ تھے
میں کہیں ہمسفرِ ابرِ رواں کیوں نہ ہُوا

اجنبی پر تو یہاں لطف سِوا ہوتا ہے
میں بھی اس شہر میں بے نام و نشاں کیوں نہ ہُوا

نارسائی تھی مرے شوق کا حاصل تو شکیبؔ
حائلِ راہ کوئی سنگِ گراں کیوں نہ ہُوا

☆

منظر تھا اک اُجاڑ نگاہوں کے سامنے
کیا کیا نہ رنگ بھر دیے افسونِ شام نے

اس حادثے کی نخوتِ ساقی کو کیا خبر
بادہ پیا کہ زہر پیا تشنہ کام نے

چہرے سے اجنبی تھا وہ میرے لیے مگر
سب راز اس کے کہہ دیے طرزِ خرام نے

نکلا نہیں ہوں آج بھی اپنے حصار سے
حدِّ نگاہ آج بھی ہے میرے سامنے

تھے حادثوں کے وار تو کاری مگر مجھے
مرنے نہیں دیا خلشِ انتقام نے

اک سانس کی طناب جو ٹوٹی تو اے شکیبؔ
دوڑے ہیں لوگ جسم کے خیمے کو تھامنے

☆

اب آپ رہِ دل جو کُشادہ نہیں رکھتے
ہم بھی سفرِ جاں کا ارادہ نہیں رکھتے

پینا ہو تو اک جرعۂ زہراب بہت ہے
ہم تشنہ دہن تُہمتِ بادہ نہیں رکھتے

اشکوں سے چراغاں ہے شبِ زیست، سو وہ بھی
کوتاہیِ مژگاں سے زیادہ نہیں رکھتے

یہ گردِ رہِ شوق ہی جم جائے بدن پر
رُسوا ہیں کہ ہم کوئی لَبادہ نہیں رکھتے

ہر گام پہ جگنو سا چمکتا ہے جو دل میں
ہم اس کے سوا مشعلِ جادہ نہیں رکھتے

سُرخی نہیں پھولوں کی تو زخموں کی شفق ہے
دامانِ طلَب ہم کبھی سادہ نہیں رکھتے

☆

جو بھی ہے طالبِ یک ذرّہ، اُسے صحرا دے
مجھ پہ مائل بہ کرم ہے، تو دلِ دریا دے

کب سے ہُوں حسرتیِٔ یک نگہِ گرم، کہ جو
محفلِ شوق کے آداب مجھے سمجھا دے

خلشِ غم سے مری جاں پہ بنی ہے، جیسے
ریشمیں شال کو کانٹوں پہ کوئی پھیلا دے

رحمتِ جاں کوئی لُٹانے ادھر آ بھی نہ سکے
ایسے مشکل تو نہیں دشتِ وفا کے جادے

بیتی یادوں کا تقاضا تو بجا ہے، لیکن
گردشِ شام و سحَر کیسے کوئی ٹھہرا دے

مجھ کو زنداں میں بھی مل جائے گا عنوانِ جُنوں
نکہتِ گُل کو کریں قید خیاباں زادے

☆

موجِ غم اس لیے شاید نہیں گزری سر سے
میں جو ڈوبا تو نہ ابھروں گا کبھی ساغر سے

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئنہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

کتنی گُم سُم مرے آنگن سے صبا گزری ہے
اک شرر بھی نہ اڑا روح کی خاکستر سے

پیار کی جوت سے گھر گھر ہے چراغاں ورنہ
اک بھی شمع نہ روشن ہوٗ ہوا کے ڈر سے

اڑتے بادل کے تعاقب میں پھرو گے کب تک
درد کی دھوپ میں نکلا نہیں کرتے گھر سے

کتنی رعنائیاں آباد ہیں مرے دل میں
اک خرابہ نظر آتا ہے مگر باہر سے

وادیِ خواب میں اس گُل کا گزر کیوں نہ ہُوا
رات بھر آتی رہی جس کی مہک بستر سے

طعنِ اغیار سُنیں آپ خموشی سے شکیبؔ
خود پلٹ جاتی ہیں ٹکرا کے صدا پتھر سے

☆

تو نے کیا کیا نہ اے زندگی، دشت و دَر میں پھرایا مجھے
اب تو اپنے در و بام بھی جانتے ہیں پرایا مجھے

اور بھی کچھ بھڑکنے لگا میرے سینے کا آتش کدہ
راس تجھ بن نہ آیا کبھی سبز پیڑوں کا سایا مجھے

ان نئی کونپلوں سے مرا کیا کوئی بھی تعلق نہ تھا
شاخ سے توڑ کر، اے صبا، خاک میں کیوں ملایا مجھے

درد کا دیپ جلتا رہا دل کا سونا پگھلتا رہا
ایک ڈوبے ہوئے چاند نے رات بھر خوں رلایا مجھے

اب مرے راستے میں کہیں خوفِ صحرا بھی حائل نہیں
خشک پتّے نے آوارگی کا قرینہ سکھایا مجھے

مدّتوں رُوئے گُل کی جھلک کو ترستا رہا میں شکیبؔ
اب جو آئی بہار، اس نے صحنِ چمن میں نہ پایا مجھے

☆

اُتر گیا تنِ نازک سے پتّیوں کا لَباس
کِسی کے ہاتھ نہ آئی مگر گلاب کی باس

اب اپنے جسم کے سائے میں تھک کے بیٹھ رہو
کہیں درخت نہیں راستے میں، دُور نہ پاس

ہزار رنگ کی ظلمت میں لے گئی مجھ کو
بس ایک چراغ کی خواہش، بس اک شرار کی آس

تمہارے کام نہ آئے گا جو بھی دانا ہے
ہر ایک شخص پہ کیوں کر رہے ہو اپنا قیاس

کسی کی آس تو ٹوٹی، کوئی تو ہار گیا
کہ نیم باز دریچوں میں روشنی ہے اُداس

وہ کالے کوس کی دوری اب ایک خواب سی ہے
تم آ گئے ہو مگر کب نہ تھے ہمارے پاس

یہ کیا طلسم ہے، جب سے کنارِ دریا ہوں
شکیبؔ اور بھی کچھ بڑھ گئی ہے رُوح کی پیاس

☆

اس خاکداں میں اب تک باقی ہیں کچھ شرر سے
دامن بچا کے گزرو یادوں کی رہ گزر سے

ہر ہر قدم پہ آنکھیں تھیں فرشِ راہ لیکن
وہ روشنی کا ہالا اُترا نہ بام پر سے

کیوں جادۂ وفا پر مشعل بکف کھڑے ہو
اس سیلِ تیرگی میں نکلے گا کون گھر سے

کس دشت کی صدا ہو، اتنا مجھے بتا دو
ہر سُو بچھے ہیں رستے آؤں تو میں کدھر سے

اُجڑا ہُوا مکاں ہے یہ دل، جہاں پہ ہر شب
پرچھائیاں لپٹ کر روتی ہیں بام و در سے

☆

اب میسّر نہیں فرصت کے وہ دن رات ہمیں
لے اُڑی جانے کہاں صرصرِ حالات ہمیں

آج وہ یُوں نگہِ شوق سے بچ کر گزرے
جیسے یاد آئے کوئی بُھولی ہوئی بات ہمیں

کیسے اُڑتے ہوئے لمحوں کا تعاقب کیجئے
دوستو! اب تو یہی فکر ہے دن رات ہمیں

نہ سہی، کوئی ہجومِ گُل و لالہ نہ سہی
دشت سے کم بھی نہیں کُنجِ خیالات ہمیں

وہ اگر غیر نہ سمجھے تو کوئی بات کریں
دلِ ناداں سے بہت سی ہیں شکایات ہمیں

دھوپ کی لہر ہے تُو، سایۂ دیوار ہیں ہم
آج بھی ایک تعلق ہے ترے سات ہمیں

رنگ و مستی کے جزیروں میں لیے پھرتے ہیں
اس کی پائل سے چُرائے ہوئے نغمات ہمیں

☆

آگ کے درمیان سے نکلا
میں بھی کس امتحان سے نکلا

پھر ہَوا سے سُلگ اٹھے پتّے
پھر دُھواں گلستان سے نکلا

جب بھی نکلا ستارۂ اُمّید
کہر کے درمیان سے نکلا

چاندنی جھانکتی ہے گلیوں میں
کوئی سایہ مکان سے نکلا

ایک شعلہ، پھر ایک دھوئیں کی لکیر
اور کیا خاکدان سے نکلا

چاند جس آسمان میں ڈوبا
کب اسی آسمان سے نکلا

یہ گُہر جس کو آفتاب کہیں
کس اندھیرے کی کان سے نکلا

شکر ہے اس نے بے وفائی کی
میں کڑے امتحان سے نکلا

لوگ دشمن ہوئے اسی کے شکیبؔ
کام جس مہربان سے نکلا

☆

وہ سامنے تھا پھر بھی کہاں سامنا ہُوا
رہتا ہے اپنے نور میں سورج چُھپا ہُوا

اے روشنی کی لہر، کبھی تو پلٹ کے آ
تجھ کو بُلا رہا ہے دَرِیچہ کُھلا ہُوا

سیراب کس طرح ہو زمیں دور دور کی
ساحل نے ہے ندی کو مقیّد کیا ہُوا

اے دوست، چشمِ شوق نے دیکھا ہے بارہا
بجلی سے تیرا نام گھٹا پر لکھا ہُوا

پہچانتے نہیں اسے محفل میں دوست بھی
چہرہ ہو جس کا گردِ اَلَم سے اَٹا ہُوا

اس دَور میں خلوص کا کیا کام اے شکیبؔ
کیوں کر چلے بساط پہ مُہرہ پٹا ہُوا

☆

تارے ہیں، نہ ماہتاب یارو
کچھ اس کا بھی سدِّباب یارو

آنکھوں میں چتائیں جل رہی ہیں
ہونٹوں پہ ہے آب آب یارو

تاحدِخیال ریگِ صحرا
تاحدِنظر سراب یارو

رہبر ہی نہیں ہے ساتھ اپنے
رہزن بھی ہیں ہم رکاب یارو

شُعلے سے جہاں لپک رہے ہیں
برسے گا وہیں سحاب یارو

☆

سمجھ سکو تو یہ تشنہ لبی سمندر ہے
بقدرِ ظرف ہر اک آدمی سمندر ہے

اُبھر کے ڈوب گئی کشتیِ خیال کہیں
یہ چاند ایک بھنور، چاندنی سمندر ہے

جو داستاں نہ بنے دردِ بیکراں ہے وہی
جو آنکھ ہی میں رہے وہ نمی سمندر ہے

نہ سوچیے تو بہت مختصر ہے سیلِ حیات
جو سوچیے تو یہی زندگی سمندر ہے

تو اس میں ڈوب کے شاید اُبھر سکے نہ کبھی
مرے حبیب! مری خامشی سمندر ہے

☆

اب یہ ویران دن کیسے ہوگا بسر
رات تو کٹ گئی درد کی سیج پر

بس یہیں ختم ہے پیار کی رہ گزر
دوست، اگلا قدم کچھ سمجھ سوچ کر

اس کی آوازِ پا تو بڑی بات ہے
ایک پتّہ بھی کھڑکا نہیں رات بھر

گھر میں طوفان آئے زمانہ ہُوا
اب بھی کانوں میں بجتی ہے زنجیرِ در

اپنا دامن بھی اب تو میسّر نہیں
کتنے ارزاں ہوئے آنسوؤں کے گُہر

یہ شکستہ قدم بھی ترے ساتھ تھے
اے زمانے ٹھہر! اے زمانے ٹھہر!

اپنے غم پر تبسّم کا پردہ نہ ڈال
دوست، ہم ہیں سوار ایک ہی ناؤ پر

☆

دستکیں دیتی ہیں شب کو درِ دل پر یادیں
کچھ نہیں ہے مگر اس گھر کا مقدّر یادیں

ڈھونڈتی ہیں تری مہکی ہُوئی زلفوں کی بہار
چاندنی رات کے زینے سے اُتر کر یادیں

عشرتِ رفتہ کو آواز دیا کرتی ہیں
ہر نئے لمحے کی دہلیز پہ جاکر یادیں

رنگ بھرتے ہیں خلاؤں میں ہیولے کیا کیا
پیش کرتی ہیں عجب خواب کا منظر یادیں

نہ کسی زلف کا عنبر، نہ گُلوں کی خوشبُو
کر گئی ہیں مری سانسوں کو معطّر یادیں

کم نہیں رات کے صحرا سے مرے دل کی فضا
اور آکاش کے تاروں سے فزوں تر یادیں

مشعلِ غم نہ بُجھاؤ کہ شکیبؔ اس کے بغیر
راستہ گھر کا بُھلا دیتی ہیں اکثر یادیں

☆

کون جانے کہاں ہے شہرِ سکوں
قریہ قریہ بھٹک رہا ہے جُنوں

نورِ منزل مجھے نصیب کہاں
میں ابھی حلقۂ غُبار میں ہوں

یہ ہے تاکید سننے والوں کی
واقعہ خوشگوار ہو تو کہوں

کن اندھیروں میں کھو گئی ہے سحَر
چاند تاروں پہ مار کر شب خُوں

تم جسے نورِ صبح کہتے ہو
میں اسے گردِ شام بھی نہ کہوں

اب تو خونِ جگر بھی ختم ہوا
میں کہاں تک خلاء میں رنگ بھروں

جی میں آتا ہے اے رہِ ظلمت
کہکشاں کو مروڑ کر رکھ دوں

☆

کہاں رُکیں گے مُسافر نئے زمانوں کے
بدل رہا ہے جُنوں زاویے اُڑانوں کے

یہ دل کا زخم ہے، اک روز بھر ہی جائے گا
شگاف پُر نہیں ہوتے فقط چٹانوں کے

چھلک چھلک کے بڑھا میری سمت نیند کا جام
پگھل پگھل کے گرے قفل قید خانوں کے

ہَوا کے دشت میں تنہائی کا گزر ہی نہیں
مرے رفیق ہیں مُطرب گئے زمانوں کے

کبھی ہمارے نقوشِ قدم کو ترسیں گے
وہی جو آج ستارے ہیں آسمانوں کے

☆

موجِ صبا رواں ہُوئی، رقصِ جُنوں بھی چاہیے
خیمۂ گُل کے پاس ہی دجلۂ خوں بھی چاہیے

کشمکشِ حیات ہے، سادہ دلوں کی بات ہے
خواہشِ مرگ بھی نہیں، زہرِ سکوں بھی چاہیے

ضربِ خیال سے کہاں ٹوٹ سکیں گی بیڑیاں
فکرِ چمن کے ہم رکاب جوشِ جنوں بھی چاہیے

نغمۂ شوق خوب تھا، ایک کمی ہے مُطربہ!
شعلۂ لَب کی خیر ہو، سوزِ دُروں بھی چاہیے

اتنا کرم تو کیجیے، بُجھتا کنول نہ دیجیے
زخمِ جگر کے ساتھ ہی دردِ فزوں بھی چاہیے

دیکھیے ہم کو غور سے، پوچھیے اہلِ جَور سے
روحِ جمیل کے لیے، حالِ زُبوں بھی چاہیے

☆

آئینہ جذباتِ نہاں ہیں تری آنکھیں
اک کارگہِ شیشہ گراں ہیں تری آنکھیں

سرچشمۂ افکارِ جواں ہیں تری آنکھیں
تابندہ خیالات کی جاں ہیں تری آنکھیں

اندازِ خموشی میں ہے گُفتار کا پہلو
گویا نہ سہی، چُپ بھی کہاں ہیں تری آنکھیں

جاؤں گا کہاں توڑ کے زنجیرِ وفا کو
ہر سُو مری جانب نِگَراں ہیں تری آنکھیں

کہنا ہے وہی جس کی توقع ہے تجھے بھی
مت پوچھ، مرے دل کی زباں ہیں تری آنکھیں

پلکوں کے جھروکوں سے سُبو جھانک رہے ہیں
اُمید گہِ تشنہ لَباں ہیں تری آنکھیں

یوں ہی تو نہیں اُمڈی چلی آتی ہیں غزلیں
پہلو میں مرے زمزمہ خواں ہیں تری آنکھیں

☆

پردۂ شب کی اوٹ میں زہرہ جمال کھوگئے
دل کا کنول بجھا تو شہر، تیرہ و تار ہوگئے

ایک ہمیں ہی اے سَحَر، نیند نہ آئی رات بھر
زانوئے شب پہ رکھ کر سر، سارے چراغ سوگئے

راہ میں تھے بَبُول بھی، رودِ شرر بھی، دُھول بھی
جانا ہمیں ضرور تھا، گُل کے طواف کوگئے

دیدہ وَرو بتائیں کیا، تم کو یقیں نہ آئے گا
چہرے تھے جن کے چاند سے، سینے میں داغ بوگئے

داغِ شکست دوستو، دیکھو کسے نصیب ہو
بیٹھے ہوئے ہیں تیز رَو، سُست خرام تو گئے

اہلِ جنوں کے دل شکیبؔ، نرم تھے موم کی طرح
تیشۂ یاس جب چلا، تودۂ سنگ ہوگئے

☆

رعنائی نگاہ کو قالب میں ڈھالیے
پتھر کے پیرہن سے سراپا نکالیے

گزرا ہے دل سے جو رمِ آہُو سا اک خیال
لازم ہے، اس کے پاؤں میں زنجیر ڈالیے

دل میں پرائے درد کی اک ٹیس بھی نہیں
تخلیق کی لگن ہے تو زخموں کو پالیے

یہ کُہر کا ہجوم درِ دل پہ تابہ کے
بامِ یقیں سے ایک نظر اس پہ ڈالیے

احساس میں رچایئے قوسِ قزح کے رنگ
اِدراک کی کمند ستاروں پہ ڈالیے

ہاں، کوزہ ہائے ِگل پہ ہے تنقید کیا ضرور
گر ہو سکے تو خاک سے خورشید ڈھالیے

اُمید کی کرن ہو کہیں حسرتوں کے داغ
ہر دَم نگار خانۂ دل کو اُجالیے

شاید کہ ان کی سمت بڑھے کوئی دشتِ شوق
روندے ہوئے گلاب فضا میں اُچھالیے

ہاں، کوہِ شب کو کاٹ کے لانا ہے جُوئے نور
ہاں، بڑھ کے آفتاب کا تیشہ سنبھالیے

وجدان کی ترنگ کا مصرف بھی ہو شکیبؔ
شاعر کی عظمتوں کو ہنسی میں نہ ٹالیے

☆

ہوائے شب سے نہ بُجھتے ہیں اور نہ جلتے ہیں
کسی کی یاد کے جگنو دھواں اُگلتے ہیں

شبِ بہار میں مہتاب کے حسیں سائے
اُداس پاکے ہمیں، اور بھی مچلتے ہیں

اسیرِ دامِ جُنوں ہیں، ہمیں رہائی کہاں
یہ رنگ و بُو کے قفس اپنے ساتھ چلتے ہیں

یہ دل وہ کارگہِ مرگ و زیست ہے کہ جہاں
ستارے ڈوبتے ہیں، آفتاب ڈھلتے ہیں

خود اپنی آگ سے شاید گداز ہوجائیں
پرائی آگ سے کب سنگ دل پگھلتے ہیں

☆

شاخو! بھری بہار میں رقصِ برہنگی!
مہکی ہُوئی وہ چادرِ گُل بار کیا ہُوئی!

بے نغمہ و صدا ہے وہ بُت خانۂ خیال
کرتے تھے گفتگو جہاں پتّھر کے ہونٹ بھی

وہ پھر رہے ہیں زخم بہ پا آج دشت دشت
قدموں میں جن کے شاخِ گُلِ تر جھکی رہی

یوں بھی بڑھی ہے وُسعتِ ایوانِ رنگ و بُو
دیوارِ گلستاں درِ زنداں سے جا ملی

رعنائیاں چمن کی تو پہلے بھی کم نہ تھیں
اب کے مگر سجائی گئی شاخِ دار بھی

☆

حُسنِ فردا، غمِ امروز سے ضَو پائے گا
چاند ڈُوبا ہے تو سورج بھی اُبھر آئے گا

آندھیوں میں بھی فروزاں ہے چراغِ اُمّید
خاک ڈالے سے یہ شُعلہ کہیں بُجھ جائے گا

کُو بہ کُو دام بچھے ہوں کہ کڑکتی ہو کماں
طائرِ دل، پرِ پرواز تو پھیلائے گا

توڑ کر حلقۂ شب، ڈال کے تاروں پہ کمند
آدمی عرصۂ آفاق پہ چھا جائے گا

ہم بھی دو چار قدم چل کے اگر بیٹھ گئے
کون پھر وقت کی رفتار کو ٹھہرائے گا

راہ میں جس کی، دیا خونِ دل و جاں ہم نے
وہ حَسیں دَور بھی آئے گا، ضرور آئے گا

☆

مجھ سے ملنے شبِ غم اور تو کون آئے گا
میرا سایہ ہے جو دیوار پہ جم جائے گا

ٹھہرو ٹھہرو، مرے اصنامِ خیالی، ٹھہرو
میرا دل گوشۂ تنہائی میں گھبرائے گا

لوگ دیتے رہے کیا کیا نہ دلاسے مجھ کو
زخم گہرا ہی سہی، زخم ہے، بھر جائے گا

عزمِ پختہ ہی سہی ترکِ وفا کا، لیکن
منتظر ہوں، کوئی آ کر مجھے سمجھائے گا

آنکھ جھپکے نہ کہیں، راہ اندھیری ہی سہی
آگے چل کر وہ کسی موڑ پہ مل جائے گا

دل سا انمول رتن کون خریدے گا شکیبؔ
جب بِکے گا تو یہ بے دام ہی بِک جائے گا

☆

مانندِ صبا جدھر گئے ہم
کلیوں کو نہال کر گئے ہم

زنجیر بپا اگر گئے ہم
نغموں کی طرح بکھر گئے ہم

سُورج کی کِرن تھے' جانے کیا تھے
ظُلمت میں اُتر گئے ہم

جب بھی کوئی سنگِ راہ دیکھا
طوفاں کی طرح بپھر گئے ہم

چلنا تھا جہاں محال یارو!
اس راہ سے بھی گزر گئے ہم

بن جائیں گی منزلیں وہیں پر
بھولے سے جہاں ٹھہر گئے ہم

ہنس ہنس کے گلے ملے قضا سے
تکمیلِ حیات کرگئے ہم

☆

ساحل سے دُور جب بھی کوئی خواب دیکھتے
جلتے ہُوئے چراغ تہِ آب دیکھتے

ہم نے فضول چھیڑ دی زخمِ نہاں کی بات
چُپ چاپ رنگِ خندۂ احباب دیکھتے

غم کی بس ایک موج نے جن کو ڈبو دیا
اے کاش وہ بھی حلقۂ گرداب دیکھتے

بیتے دنوں کے زخم کُریدے ہیں رات بھر
آئی نہ جن کو نیند وہ کیا خواب دیکھتے

کشکولِ شعرِ تر لیے پھرتے نہ ہم شکیبؔ
اس ریشمیں بدن پہ جو کمخواب دیکھتے

☆

میٹھے چشموں سے، خُنک چھاؤں سے دُور
زخم کِھلتے ہیں ترے گاؤں سے دُور

سنگِ منزل نے لہو اُگلا ہے
دُور، ہم بادیہ پیماؤں سے دُور

کتنی شمعیں ہیں اسیرِ فانوس
کتنے یوسف ہیں زلیخاؤں سے دُور

کِشتِ امید سلگتی ہی رہی
ابر برسا بھی تو صحراؤں سے دُور

جَورِ حالات، بھلا ہو تیرا
چین ملتا ہے شناساؤں سے دُور

ق

جنّتِ فکر بُلاتی ہے چلو
دَیر و کعبہ سے، کلیساؤں سے دُور

رقصِ آشفتہ سراں دیکھیں گے
دُور، ان انجمن آراؤں سے دُور

جُستجو ہے دُرِیکتا کی شکیبؔ
سیپیاں چُنتے ہیں دریاؤں سے دُور

☆

کچھ دن اگر یہی رہا دیوار و در کا رنگ
دیوار و در پہ دیکھنا خونِ جگر کا رنگ

بُھولا نہیں ہوں مقتلِ اُمّید کا سماں
تحلیل ہو رہا تھا شفق میں سحر کا رنگ

دنیا غریقِ شُعبدۂ جامِ جم ہوئی
دیکھے گا کون خُونِ دلِ کوزہ گر کا رنگ

اُلجھے ہوئے دھویں کی فضا میں ہے اک لکیر
کیا پُوچھتے ہو شمعِ سرِ رہ گزر کا رنگ

دامانِ فصلِ گُل پہ خزاں کی لگی ہے چھاپ
ذوقِ نظر پہ بار ہے برگ و ثمر کا رنگ

جمنے لگی شکیبؔ جو پلکوں پہ گردِ شب
آنکھوں میں پھیلنے لگا خوابِ سحر کا رنگ

☆

ہر ایک بات ہے مِنّت کشِ زباں لوگو
نہیں ہے کوئی بھی اپنا مزاج داں لوگو

کچھ اس طرح وہ حقائق کو سُن کے چونک اُٹھے
بکھر گئیں سرِ محفل پہیلیاں لوگو

مرے لَبوں سے کوئی بات بھی نہیں نکلی
مگر تراش لیں تم نے کہانیاں لوگو

بہارِ نو بھی انہیں پھر سجا نہیں سکتی
بکھر گئی ہیں جو پھولوں کی پتّیاں لوگو

بڑا زمانہ ہُوا آشیاں کو راکھ ہُوئے
مگر نگاہ ہے اب تک دُھواں دُھواں لوگو

خطا معاف، کہ مے سے شکیبؔ مُنکر ہے
اُسے عزیز ہیں دنیا کی تلخیاں لوگو

☆

ہم آج ہیں پھر مَلُول یارو
مرجھا گئے کِھل کے پُھول یارو

گزرے ہیں خزاں نصیب ادھر سے
پیڑوں پہ جمی ہے دُھول یارو

تاحدِّ خیال، لالہ و گُل
تاحدِّ نظر، ببُول یارو

جب تک کہ ہَوس رہی گُلوں کی
کانٹے بھی رہے قبُول یارو

ہاں، کوئی خطا نہیں تمہاری
ہاں، ہم سے ہوئی ہے بُھول یارو

☆

باقی ہے یہی ایک نشاں موسمِ گُل کا
جاری رہے گلشن میں بیاں موسمِ گُل کا

جب پُھول مرے چاکِ گریباں پہ ہنسے تھے
لمحہ وہی گزرا ہے گراں موسمِ گُل کا

نادان گھٹاؤں کے طلَب گار ہُوئے ہیں
شُعلوں کو بنا کر نگراں موسمِ گُل کا

سُوکھے ہوئے پتّوں کے جہاں ڈھیر ملے ہیں
دیکھا تھا وہیں سیلِ رواں موسمِ گُل کا

☆

کوئی دیکھے تو سہی یارِ طرحدار کا شہر
میری آنکھوں میں سجا ہے لَب و رُخسار کا شہر

دشتِ احساس میں شعلہ سا کوئی لپکا تھا
اسی بنیاد پہ تعمیر ہُوا پیار کا شہر

اُس کی ہر بات میں ہوتا ہے کسی بھید کا رنگ
وہ طِلِسمَات کا پیکر ہے کہ اَسرار کا شہر

میری نظروں میں چراغاں کا سماں رہتا ہے
میں کہیں جاؤں، مرے ساتھ ہے دلدار کا شہر

یوں تری گرم نگاہی سے پگھلتے دیکھا
جس طرح کانچ کا گھر ہو مرے پندار کا شہر

دل کا آفاق سمٹتا ہی چلا جاتا ہے
اور پھیلے گا کہاں تک در و دیوار کا شہر

مسکراتے رہیں سینے کے دہکتے ہُوئے داغ
دائم آباد رہے درد کی سرکار کا شہر

☆

دیکھتی رہ گئی محرابِ حرم
ہائے انسان کی انگڑائی کا خم

جب بھی اوہام مقابل آئے
مثلِ شمشیر چلی نوکِ قلم

پرِ پرواز پہ یہ راز کُھلا
پستیوں سے تھا بلندی کا بھرم

غم کی دیوار گری تھی جن پر
ہم وہی لوگ ہیں، اے قصرِ اِرم

چاندنی غازۂ پائے جَولاں
کہکشاں جادۂ ابنِ آدم

ایک تارہ بھی نہ پامال ہُوا
ایسے گزرے رہِ اَفلاک سے ہم

☆

دنیا والوں نے چاہت کا مجھ کو صِلہ انمول دیا
پیروں میں زنجیریں ڈالیں، ہاتھوں میں کشکول دیا

اِتنا گہرا رنگ کہاں تھا رات کے میلے آنچل کا
یہ کس نے رو رو کے، گگن میں اپنا کاجل گھول دیا

یہ کیا کم ہے اس نے بخشا ایک مہکتا درد مجھے
وہ بھی ہیں جن کو رنگوں کا اک چمکیلا خول دیا

مجھ سا بے مایہ اپنوں کی اور تو خاطر کیا کرتا
جب بھی ستم کا پَیکاں آیا، میں نے سینہ کھول دیا

بیتے لمحے دھیان میں آ کر مجھ سے سوالی ہوتے ہیں
تو نے کس بنجر مٹّی میں من کا امرت ڈول دیا

اشکوں کی اُجلی کلیاں ہوں یا سپنوں کے کُندن پھول
اُلفت کی میزان میں مَیں نے جو تھا سب کچھ تول دیا

☆

برگِ دل کی طرح ہے زرد ہَوا
پھانکتی ہے کہاں کی گرد ہَوا

دل میں یادوں کا زہر گھول دیا
کتنی قاتل ہے بَن کی سرد ہَوا

روز لاتی ہے اَن کہے پیغام
شہرِ خُوباں سے کوچہ گرد ہَوا

ق

دم نہ مارے، مری طرح جو سہے
اس زمانے کے گرم و سرد ہَوا

میں ہوں شعلہ بجاں، چراغ بدست
ڈھونڈ کر لائے مجھ سا فرد ہَوا

سانس گھُٹتی ہے شہرِ تن میں شکیبؔ
کس خلا کی ہے رَہ نَورد ہَوا

☆

روشن ہیں دل کے داغ، نہ آنکھوں کے شب چراغ
کیوں شام ہی سے بُجھ گئے محفل کے سب چراغ

وہ دن نہیں، کرن سے کرن میں لگے جو آگ
وہ شب کہاں، چراغ سے جلتے تھے جب چراغ

تِیرہ ہے خاکداں، تو فلک بے نجوم ہے
لائے کہاں سے مانگ کے دستِ طلب چراغ

روشن ضمیر آج بھی ظلمت نصیب ہیں
تم نے دیے ہیں پوچھ کے نام و نَسب چراغ

وہ تیرگی ہے دشتِ وفا میں کہ اَلاماں!
چمکے جو موجِ ریگ تو پائے لقب چراغ

دن ہو اگر تو رات سے تعبیر کیوں کریں
سورج کو اہلِ ہوش دکھاتے ہیں کب چراغ

اے بادِ تُند! وضع کے پابند ہم بھی ہیں
پتّھر کی اوٹ لے کے جلائیں گے اب چراغ

☆

یہ جلوہ گاہِ ناز تماشائیوں سے ہے
رونق جہاں کی انجمن آرائیوں سے ہے

روتے ہیں دل کے زخم تو ہنستا نہیں کوئی
اِتنا تو فائدہ مجھے تنہائیوں سے ہے

دیوانۂ حیات کو اک شغل چاہیے
نادانیوں سے کام نہ دانائیوں سے ہے

قیدِ بیاں میں آئے جو ناگفتنی نہ ہو
وہ رابطہ کہ قلب کی گہرائیوں سے ہے

نادم نہیں ہوں داغِ فرومائیگی پہ میں
تیرا بھرم بھی میری جبیں سائیوں سے ہے

☆

دل میں لرزاں ہے ترا شعلۂ رخسار اب تک
میری منزل میں نہیں رات کے آثار اب تک

پُھول مُرجھا گئے' گُلدان بھی گر کر ٹوٹا
کیسی خوشبو میں بسے ہیں در و دیوار اب تک

حسرتِ دار نہاں ہے مرے دل میں شاید
یاد آتی ہے مجھے قامتِ دلدار اب تک

وہ اُجالے کا کوئی سیلِ رَواں تھا' کیا تھا
میری آنکھوں میں ہے اک ساعتِ دیدار اب تک

تیشۂ غم سے ہُوئی روح تو ٹکڑے ٹکڑے
کیوں سلامت ہے مرے جسم کی دیوار اب تک

☆

دشت و صحرا اگر بسائے ہیں
ہم گلستاں میں کب سمائے ہیں

آپ نغموں کے منتظر ہوں گے
ہم تو فریاد لے کے آئے ہیں

ایک اپنا دیا جلانے کو
تم نے لاکھوں دیئے بجھائے ہیں

کیا نظر آئے گا' ابھی ہم کو
یک بیک روشنی میں آئے ہیں

یوں تو سارا چمن ہمارا ہے
پُھول جتنے بھی ہیں' پرائے ہیں

☆

جس قدر خود کو وہ چھپاتے ہیں
لوگ گرویدہ ہوتے جاتے ہیں

جو بھی ہمدرد بن کے آتے ہیں
غم کا احساس ہی جگاتے ہیں

عہدِ ماضی کے زرفشاں لمحے
شدتِ غم میں مسکراتے ہیں

خود کو بدنام کر رہا ہوں میں
ان پہ الزام آئے جاتے ہیں

اجنبی بن کے جی رہا ہوں میں
لوگ مانوس ہوتے جاتے ہیں

☆

چوٹ ہر گام پہ کھا کر جانا
قربِ منزل کے لیے مر جانا

ہم بھی کیا سادہ نظر رکھتے تھے
سنگ ریزوں کو جَواہر جانا

مشعلِ درد جو روشن دیکھی
خانۂ دل کو منّور جانا

رشتۂ غم کو رگِ جاں سمجھے
زخمِ خنداں کو گُلِ تر جانا

یہ بھی ہے کارِ نسیمِ سحَری
پتّی پتّی کو جُدا کر جانا

اپنے حق میں وہی تلوار بنا
جسے اک پُھول سا پیکر جانا

دشمنوں پر کبھی تکیہ کرنا
اپنے سائے سے کبھی ڈر جانا

کاسۂ سر کو نہ دی زخم کی بھیک
ہم کو مجنوں سے بھی کم تر جانا

اس لیے اور بھی خاموش تھے ہم
اہلِ محفل نے سخن ور جانا

☆

پاس رہ کے بھی بہت دُور ہیں دوست
اپنے حالات سے مجبور ہیں دوست

ترکِ الفت بھی نہیں کر سکتے
ساتھ دینے سے بھی معذور ہیں دوست

گفتگو کے لیے عنواں بھی نہیں
بات کرنے پہ بھی مجبور ہیں دوست

یہ چراغ اپنے لیے رہنے دے
تیری راتیں بھی تو بے نُور ہیں دوست

سبھی پژمردہ ہیں محفل میں شکیبؔ
میں پریشاں ہوں، رنجُور ہیں دوست

نظمیں

پاداش

کبھی اس سُبک رَو ندی کے کنارے گئے ہی نہیں ہو
تمھیں کیا خبر ہے
وہاں اَن گنت کُھردرے پتّھروں کو
سجَل پانیوں نے
ملائم، رسیلے، مدھر گیت گا کر
امٹ چکنی گولائیوں کو ادا سونپ دی ہے
وہ پتھر نہیں تھا
جسے تم نے بے ڈول، اَن گھڑ سمجھ کر
پُرانی چٹانوں سے ٹکرا کے توڑا
اب اس کے سُلگتے تراشے
اگر پاؤں میں چُبھ گئے ہیں
تو کیوں چیختے ہو؟

اِندمال

شام کی سیڑھیاں کتنی کرنوں کا مقتل بنیں
بادِ مسموم نے توڑ کر کتنے پتّے سپردِ خزاں کر دیے
بہہ کے مشکیزۂ اَبر سے کتنی بوندیں زمیں کی غذا بن گئیں
غیر ممکن تھا ان کا شمار
تھک گئیں گننے والے ہر اک ہاتھ کی اُنگلیاں
''ان گنت'' کہہ کے آگے بڑھا وقت کا کارواں
ان گنت تھے مرے زخمِ دل
ٹوٹی کرنوں، بکھرتے ہوئے زرد پتّوں، برستی ہوئی بوندیوں کی طرح
اور مرہم بھی ناپَید تھا
لیکن اس روز دیکھا جو اک طفلِ نوزائیدہ کا خندۂ زیرِ لَب
زخمِ دل مُندمل ہو گئے سب کے سب!

جہت کی تلاش

یہاں درخت کے اُوپر اُگا ہوا ہے درخت
زمین تنگ ہے (جیسے کبھی فراخ نہ تھی)
ہَوا کا کال پڑا ہے، نمی بھی عام نہیں
سمندروں کو بِلو کر، فضاؤں کو مَتھ کر
جنم دیے ہیں اگر چند ابر کے ٹکڑے
جھپٹ لیا ہے اُنھیں یوں دراز شاخوں نے
کہ نیم جان تنے کو ذرا خبر نہ ہوئی
جڑیں بھی خاک تلے ایک ہی لگن میں رواں
نہ تیرگی سے مَفَر ہے، نہ روشنی کا سوال
زمیں میں پاؤں دھنسے ہیں، فضا میں ہات بلند
نئی جہت کا لگے اب درخت میں پیوند

دلاسہ

ہم ملے کب تھے
جُدائی پر جو ہوں ویراں نگاہ و غم بجاں
ہات میں ہو نرم ہات
لَب ہوں لَب پر مہرباں
اس پہ کیا موقوف ہے ربطِ بہم کی داستاں
رہ گزارِ خاک پر
دور سے دو رَویہ پیڑوں کی قطاریں
لاکھ آتی ہوں نظر
اپنے سر جوڑے ہُوئے
درمیاں ان کے مگر
کب نہ حائل تھا غبارِ رہ گزر

ہم ملے کب تھے
جُدائی پر جو ہوں ویراں نگاہ و چشمِ تَر

یاد

رات اک لڑکھڑاتے جھونکے سے
ناگہاں سنگِ سُرخ کی سِل پر
آئینہ گر کے پاش پاش ہوا
اور ننھی نکیلی کرچوں کی
ایک بوچھاڑ دل کو چیر گئی

جاگتی آنکھیں

کس کو گماں تھا، اِک نقطے کی آغوش اتنی کشادہ ہوگی
جس میں اَنت سرے تک رنگ بھری پہنائی
گُھل مل کر رہ جائے گی

کس کو خبر تھی، انجانے پن کی گرد ایک لَبادہ ہوگی
جس کے تلے صدیوں کی سَر بستہ دانائی
اپنی چَھب دِکھلائے گی
کس کو یقیں تھا، دُور کے لمس کی تاثیر اتنی زیادہ ہوگی
جس سے سنگیں پیکر میں جامد رعنائی
رُوح کی قُدرت پائے گی

ایسی انہونی باتوں میں سچ کی کرنیں ٹانک چُکا ہُوں
میں ان جاگتی آنکھوں کے گمبھیر طِلسم میں جھانک چکا ہُوں

گُریزپا

دھیرے دھیرے گر رہی تھیں نخلِ شب سے چاندنی کی پتّیاں
بہتے بہتے اَبر کا ٹکڑا کہیں سے آ گیا تھا درمیاں
ملتے ملتے رہ گئی تھیں مخملیں سبزہ پہ دو پرچھائیاں
جس طرح سپنے کے جُھولے سے کوئی اندھے کنویں میں جا گرے
ناگہاں کُجلا گئے تھے شرمگیں آنکھوں کے نُورانی دِیے
جس طرح شورِ جَرَس سے کوئی واماندہ مسافر چونک اُٹھے
یک بیک گھبرا کے وہ نکلی تھی میرے بازوؤں کی قید سے
لَب سُلگتے رہ گئے تھے، چِھن گیا تھا جام بھی
اور میری بےبسی پر ہنس پڑی تھی چاندنی

آج تک احساس کی چلمن سے اُلجھا ہے یہ مُبہم سا سوال
اُس نے آخر کیوں بُنا تھا بہکی نظروں سے حَسیں چاہت کا جال؟

لرزتا دیپ

دورِ شب کا سرد ہات
آسماں کے خیمۂ زنگار کی
آخری قندیل گُل کرنے بڑھا
اور کومل چاندنی
ایک دَر بستہ گھروندے سے پرے
مُضمحل پیڑوں پہ گر کر بُجھ گئی

بے نشاں سائے کی دھیمی چاپ پر
اُونگھتے رستے کے ہر ذرّے نے پل بھر کے لیے
اپنی پلکوں کی بُجھتی درزوں سے جھانکا
اور آنکھیں مُوند لیں

اس سمے طاقِ شکستہ پر لرزتے دیپ سے
میں نے پوچھا:
ہم نفس!
اب ترے بُجھنے میں کتنی دیر ہے؟

سفیر

میں روشنی کا مُغنّی، کرن کرن کا سفیر
وہ سیلِ مہ سے کہ رُودِ شرار سے آئے
وہ جامِ مے سے کہ چشمِ نگار سے آئے
وہ موجِ باد سے یا آبشار سے آئے
وہ دستِ گُل سے کہ پائے فگار سے آئے
وہ لوحِ جاں سے کہ طاقِ مزار سے آئے
وہ قصرِ خواب سے یا خاک زار سے آئے
وہ برگِ سبز سے یا چوبِ دار سے آئے
جہاں کہیں ہو دلِ داغ دار کی تنویر
وہیں کُھلیں مری بانہیں، وہیں کٹے زنجیر

اِنفرادیّت پرست

ایک انساں کی حقیقت کیا ہے
زندگی سے اسے نسبت کیا ہے
آندھی اُٹھے تو اُڑا لے جائے
موج بپھرے تو بہا لے جائے
ایک انساں کی حقیقت کیا ہے
ڈگمگائے تو سہارا نہ ملے
سامنے ہو پہ کنارا نہ ملے
ایک انساں کی حقیقت کیا ہے
کُند تلوار قلم کر ڈالے
سرد شعلہ ہی بھسم کر ڈالے
زندگی سے اسے نسبت کیا ہے
ایک انساں کی حقیقت کیا ہے

عکس اور میں

آبجُو میں ایک طلسمی عکس اُبھرا تھا ابھی

دیکھے عارض...... آئینے میں تیز شعلوں کی ضیا
احمریں لَب...... زخمِ تازہ موجِ خُوں سے آشنا
تیکھے اَبرو......لَوحِ سیمیں پر دھوئیں کا خط کھنچا
بکھرے گیسُو...... کالی راتوں کا ملائم ڈھیر سا
بہتی افشاں...... جگمگاتی مشعلوں کا قافلا
گہری آنکھیں......دُور تک منظر سُہانے خواب کا

آبجُو میں اک طلسمی عکس اُبھرا تھا ابھی

نُقرئی پانی کے جو آنچل میں جھلمل کر رہی تھی، کون تھی
حُور تھی تخئیل کے رَمنوں کی یا وہ جل پری تھی، کون تھی
اس پہیلی کی گرہ کُھلنے سے پہلے ہی نگاہوں پر مری
ریشمیں قدموں کی آہٹ سے خلا کی سبز چلمن آ گری

آبجُو میں نرم لہروں کا خرامِ بے جرَس
یا کفِ ساحل پہ میرے نقشِ پا تھے اور بَس!

دعوتِ فکر

کس طرح ریت کے سمندر میں
کشتیِ زیست ہے رَواں، سوچو

سُن کے بادِ صبا کی سرگوشی
کیوں لرزتی ہیں پتّیاں، سوچو

پتّھروں کی پناہ میں کیوں ہے
آئنہ ساز کی دُکاں، سوچو

اصل سرچشمۂ وفا کیا ہے
وجہِ بے مہریِ بُتاں، سوچو

ذوقِ تعمیر کیوں نہیں مِٹتا
کیوں اُجڑتی ہیں بستیاں، سوچو

فکرِ سُقراط ہے کہ زہر کا گھونٹ
باعثِ عُمرِ جاوداں، سوچو

لوگ معنی تراش ہی لیں گے
کوئی بے ربط داستاں، سوچو

زاویے

رات تھی، میں تھا اور اک میری سوچ کا جال
پاس سے گزرے تین مسافر، دھیمی چال

پہلا بولا...... مت پوچھو اس کا احوال
دیکھ لو تن پر خون کی فرغل، خون کی شال

دوسرا بولا...... اور ہی کچھ ہے میرا خیال
یہ تو خزاں کا چاند ہے، گھائل، غم سے نڈھال

تیسرا بولا...... بس یوں سمجھو اِس کی مثال
اندھیارے کے بَن میں جیسے شب کا غزال

اُن کی روح تھی خود کالی، پیلی اور لال
میرا وجود ہے ورنہ اب تک ایک سوال

ہمارا دَور

گُلوں میں حُسن، شگوفوں میں بانکپن ہوگا
وہ وقت دُور نہیں جب چمن چمن ہوگا

جہاں پہ آج بگولوں کا رقص جاری ہے
وہیں پہ سایۂ شمشاد و نسترن ہوگا

فضائیں زرد لَبادے اُتار پھینکیں گی
عروسِ وقت کا زَرکار پیرہن ہوگا

نسیمِ صبح کے جھونکے جواب دہ ہوں گے
کسی کلی کا بھی ماتھا جو پُر شکن ہوگا

نئے اصول نئی منزلیں تراشیں گے
یہ قافلہ مہ و انجم میں خیمہ زَن ہوگا

بڑے سکون سے تعمیرِ زندگی ہوگی
کہیں یزید، نہ آذر، نہ اہرمن ہوگا

بُتانِ عصر کے خالق کو باخبر کردو
نئے زمانے کا ہر فرد بُت شکن ہوگا

دُکھے دلوں کی خراشیں جو کرسکے محسوس
اک ایسا صاحبِ دل صدرِ انجمن ہوگا

ہمارا دَور مساوات لے کے آئے گا
ہمارے دَور میں ہر آدمی مگن ہوگا

شہرِ گُل

کچھ نہ تھا شوخیِ رفتارِ صبا کا حاصل
نکہتِ گل کی پھواروں پہ کڑے پہرے تھے

چمپئی بیل کے سیّال نمُو پر قدغن
سرو و سوسن کی قطاروں پہ کڑے پہرے تھے

حلقۂ برق میں اربابِ گلستاں محبوس
دم بخود راہ گزاروں پہ کڑے پہرے تھے

دفعتاً شور ہُوا' ٹوٹ گئیں زنجیریں
زمزمہ ریز ہوئیں مُہر بلَب تصویریں

دو گھڑی کے لیے گھر گھر میں چراغاں سا ہُوا
جیسے ضَو کاریٔ انجم پہ کوئی قید نہیں

بند کلیوں نے تراشیدہ لَبوں کو کھولا
پھول سمجھے کہ تبسّم پہ کوئی قید نہیں

گھنگریاں باندھ کے پَیروں میں صبا اِٹھلائی
جیسے اندازِ ترنّم پہ کوئی قید نہیں

یہ فقط خواب تھا' اس خواب کی تعبیر بھی ہے
شہرِ گُل میں کوئی ہنستی ہُوئی تصویر بھی ہے

خداوندانِ جمہُور سے!

عُروسِ صبح سے آفاق ہمکنار سہی
شکستِ سلسلۂ قیدِ انتظار سہی

نگاہِ مہرِ جہاں تاب کیوں ہے شرمندہ
شفق کا رنگ شہیدوں کی یادگار سہی

بکھرتے خواب کی کڑیوں کو آپ چُن دیجے
کیا تھا عہد جو ہم نے وہ پائیدار سہی

ہجومِ لالہ و ریحاں سے داد چاہتے ہیں
یہ چاک چاک گریباں گلے کا ہار سہی

گِنے جو زخمِ رگِ جاں' شریکِ جشنِ حیات
پیے جو ساغرِ زہراب بادہ خوار سہی

چمن میں رنگِ طرب کی کوئی کمی نہ رہے
ہمارا خونِ جگر غازۂ بہار سہی

تھکن سے چُور ہیں پاؤں، کہاں کہاں بھٹکیں
ہر ایک گام نیا حُسنِ رہ گزار سہی

سُکوں بدوش کنارا بھی اب اُبھر آئے
سفینہ ہائے دل و جاں بھنور کے پار سہی

نئی کرن

جہاں پناہ! سِسکنے لگی چراغ کی لَو
شعاعِ تازہ سے چَھلنی ہے سینۂ ظلمات

بُلند بام ہراساں ہیں رہ نشینوں سے
اک ایسے موڑ پہ آئی ہے گردشِ حالات

جسے بھی دیکھیے لَب پر سجائے پھرتا ہے
نرالے دَور کا قصّہ، اُچھوتے دَور کی بات

جنہیں تھا حکمِ خموشی وہی پُکار اُٹھے
ہمیں بھی اذنِ تبسّم، ہمیں بھی اذنِ حیات

طلَب ہوئی ہے جنہیں بے کراں اُجالوں کی
سرابِ نجم و قمر سے بہل نہیں سکتے

نئی کرن سے اندھیروں میں برہمی ہی سہی
نئی کرن کو اندھیرے نگل نہیں سکتے

جہاں پناہ! جمالِ سحر کی جُوئے رواں
اُفق اُفق کو درخشاں بنا کے دم لے گی

پلک پلک سے مٹائے گی داغ اشکوں کے
نظر نظر کو تبسّم سِکھا کے دم لے گی

خزاں رسیدہ چمن ہوں کہ ریت کے ٹیلے
قدم قدم پہ شگوفے کِھلا کے دم لے گی

اَزل سے سینۂ ویراں ہے منتظر جس کا
نفس نفس وہی خوشبو رَچا کے دم لے گی

جشنِ عید

سبھی نے عید منائی مرے گلستاں میں
کسی نے پُھول پروئے، کسی نے خار چُنے
بنامِ اِذنِ تکلّم، بنامِ جبرِ سُکوت
کسی نے ہونٹ چبائے، کسی نے گیت بُنے

بڑے غضب کا گلستاں میں جشنِ عید ہُوا
کہیں تو بجلیاں کوندیں، کہیں چنار جلے
کہیں کہیں کوئی فانوس بھی نظر آیا
بطورِ خاص، مگر قلبِ داغ دار جلے

عجب تھی عیدِ خُمستاں، عجب تھا رنگِ نشاط
کسی نے بادہ و ساغر، کسی نے اشک پیے
کسی نے اطلس و کمخواب کی قبا پہنی
کسی نے چاکِ گریباں، کسی نے زخم سیے

ہمارے ذوقِ نظارہ کو عید کے دن بھی
کہیں پہ سایۂ ظلمت، کہیں پہ نُور ملا
کسی نے دیدہ و دل کے کنول کِھلے پائے
کسی کو ساغرِ احساس چکنا چُور ملا

بہ فیضِ عید بھی پیدا ہوئی نہ یک رنگی
کوئی مُلول، کوئی غم سے بے نیاز رہا
بڑا غضب ہے، خداوندِ کوثر و تسنیم!
کہ روزِ عید بھی طبقوں کا امتیاز رہا

لہُو ترنگ

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے شہیدوں کی یاد میں!

(پہلی آواز)
ہمیں قبول نہیں زندگی اسیری کی
ہم آج طوق و سلاسل کو توڑ ڈالیں گے
ہمارے دیس پہ اغیار حکمراں کیوں ہوں
ہم اپنے ہاتھ میں لوح و قلم سنبھالیں گے
فضا مہیب سہی، مرحلے کٹھن ہی سہی
سفینہ حلقۂ طوفاں سے ہم نکالیں گے
نقوشِ راہ اگر تیرگی میں ڈوب گئے
ہم اپنے خُوں سے ہزاروں دیے جلالیں گے

(دوسری آواز)

جو لوگ لے کے اُٹھے ہیں علم بغاوت کا
انہیں خود اپنی ہلاکت پہ نوحہ خواں کر دو
بجھاؤ گرم سلاخوں کو ان کی آنکھوں میں
زبانیں کھینچ لو گُدّی سے، بے زباں کر دو
ہدف بناؤ دلوں کو سُلگتے تیروں کا
سِناں سے جسموں کو چھیدو، شِکستہ جاں کردو
محل سرا کی حدوں تک کوئی پہنچ نہ سکے
ہر ایک گام پہ اِستادہ سُولیاں کردو

(پہلی آواز)

یہ غم نہیں کہ سَرِدار آئے جاتے ہیں
ہمیں خوشی ہے، وطن کو جگائے جاتے ہیں
ہمارے بعد سہی، رات ڈھل تو جائے گی
دلوں میں شمعِ جنوں تو جلائے جاتے ہیں
ہمارےنقشِ قدم دیں گے منزلوں کا سُراغ
ہمیں شکست نہ ہوگی، بتائے جاتے ہیں
جواں رہیں گی ہمارے لہُو کی تحریریں
سدا بہار شگوفے ِکھلائے جاتے ہیں

عید کی بھیک

حضور، آپ مرے مائی باپ، اَن داتا
حضور، عید کا دن روز تو نہیں آتا
حضور، آج تو نذرِ علیؑ، نیازِ رسولؐ
حضور، آپ کے گھر میں ہو رحمتوں کا نزول
حضور، آج ملے جان و مال کی خیرات
حضور، آپ کے اہل و عیال کی خیرات
حضور، احمدِؐ مُرسل کی آلؑ کا صدقہ
حضور، فاطمہؑ زہرا کے لال کا صدقہ
حضور، آپ کی اولاد و آبرو کی خیر
حضور، آپ کے بیٹے کی اور بہو کی خیر
حضور، آپ کے بچے جئیں، پھلیں پُھولیں
حضور، آپ عزیزوں کی ہر خوشی دیکھیں
حضور، آپ کو مَولا سدا سُکھی رکھے
حضور، آپ کی جھولی خدا بھری رکھے
حضور، نامِ خدا کارِ خیر فرمائیں
حضور، آپ کے دل کی مُرادیں برآئیں

حضور، آج گداگر کو بھیک مل جائے
حضور، کب سے کھڑا ہوں میں ہاتھ پھیلائے
حضور، آنے دو آنے کی بات ہی کیا ہے
حضور، آنکھیں چُرانے کی بات ہی کیا ہے
حضور، میری صداؤں پہ غور تو کیجئے
فقیر یہ نہیں کہتا، گلے لگا لیجے

بنامِ اہلِ چمن

چمن میں، اہلِ چمن! فکرِ رنگ و بُو تو کرو
بُجھے بُجھے سے شگوفوں کو شعلہ رُو تو کرو

ابھی سے جشنِ بہاراں! ابھی سے شغلِ جُنوں
کلی کلی کو گلستاں میں سُرخرو تو کرو

یہیں پہ لالہ و گُل کا ہجوم دیکھو گے
خلوصِ دل سے بہاروں کی آرزو تو کرو

یہ کیا کہ گوشئہ صحرا میں تھک کے بیٹھ گئے
اگر قیام کرو، نزدِ آبِ جُو تو کرو

گھنیری چھاؤں کی وادی یہیں کہیں ہوگی
کڑکتی دھوپ میں سائے کی جستجو تو کرو

بلندیوں کے مکینو، بہت اُداس ہیں ہم
زمیں پہ آ کے کبھی ہم سے گفتگو تو کرو

تمھیں بھی علم ہو، اہلِ وفا پہ کیا گزری
تم اپنے خونِ جگر سے کبھی وضو تو کرو

نہیں ہے ریشم و کمخواب کی قبا، نہ سہی
ہمارے دامنِ صد چاک کو رفو تو کرو

نگارِ صبحِ گریزاں کی تابشوں کو کبھی
ہمارے خانۂ ظلمت کے رُو برو تو کرو

طلوعِ مہرِ درخشاں ابھی کہاں یارو
سیاہیوں کے اُفق کو لہو لہو تو کرو